اردو مرثیے کی روایت اور مراثیِ انیس کی خصوصیات

عطاالله رحیم
پی ایچ ڈی سکالر (عربی) نمل، اسلام اباد
ڈاکٹر کفایت الله ہمدانی
صدر شعبہ عربی، نمل، اسلام اباد

TRADITION OF URDU ELEGY AND
CHARACTERISTICS OF ELEGIES BY ANEES

Attullah Rahim
PhD Scholar(Arabic) NUML, Islamabad

Kifayatullah Hamdani, PhD
Chairman Department of Arabic, NUML, Islamabad

Abstract

Mir Anees is one of the prominent Urdu elegiac poets. His poetry has a strong traditional literary background. There are some aspects and qualities which make his elegiac poetry prominent and attractive among the rest. He has full command on the poetic tools, techniques and traditional wordings employed in elegies. This study sheds light on the salient features of his poetry which include emotional expression, imagery, usage of prosodic and rhetoric elements.

Keywords

امام حسینؓ، فرخی، سلطان محمود، مرثیہ، روایت، انیس، خصائص، عربی، فارسی

مرثیہ ایک عربی الاصل لفظ ہے جو "رثا" سے ماخوذ ہے۔عربی میں "رثا" کے معنی ہیں کسی کی موت پراس کی تعریف بیان کرنا۔گویا مرثیہ اس نظم کو کہا جاتا ہے جو کسی کی موت پر اس کی تعریف وتوصیف میں کہی جائے اور مرنے والے کی خوبیاں اور خصائص بیان کیے جائیں۔جامع نسیم اللغات میں مرثیے کے معنی یہ درج ہیں:

> وہ نظم یا اشعار جن میں کسی شخص کی وفات یا شہادت اوراس کی مصیبتوں کا دردناک بیان ہو اور اس کے فضائل حسنہ کا ذکر کیا جائے خصوصاً شہدائے کربلا کا تذکرہ دردناک لہجے میں عموماً بشکل مسدس نظم کیا جاتا ہے۔(۱)

مرثیے کا آغاز بطور صنف سخن سب سے پہلے عربی میں شخصی مرثیے کی صورت میں ہوا۔عربی ادب کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے ظہور اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں بھی مرثیے کہے جاتے تھے۔عربی ادب کی تاریخ میں دو مرثیہ نگار شعرا معروف تھے: متمم بن نویرہ اور خنساء۔یہ دونوں اپنے مرثیوں کے باعث شہرت رکھتے تھے۔

مرثیہ عربی ہی سے فارسی میں آیا اور فارسی ادب کا حصہ بنا۔فارسی ادب میں اسے بطور خاص شہرت تب ملی جب طہماسپ صفوی کے حکم پر فارسی کے معروف شاعر محتشم کاشانی نے امام حسینؓ اوران کے اصحاب کی شہادت پر اپنا مشہور مرثیہ لکھا۔

اس کے بعد فارسی ہی کے معروف شاعر فرخی نے سلطان محمود کا مرثیہ لکھا اور مرثیے کو نہ صرف ادبی حیثیت حاصل ہوگئی بلکہ اس کا ادبی مقام مائل بہ ترقی ہوگیا۔سلطان محمود پر فرخی کا لکھا ہوا مرثیہ زبان واظہار بیان کے علاوہ اس لیے بھی اہم قرار پایا کہ اس میں مرثیہ نگاری کے اصول وقواعد کو وضع کرنے کی سعی بھی کی گئی تھی۔اس امر نے مرثیے کو نہ صرف مستقبل کا راستہ دکھا دیا بلکہ اس کے ارتقا کے قواعد وضوابط کی نشاندہی بھی کی۔فرخی کے اس معروف مرثیے کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی نے کہا ہے کہ فرخی کا لکھا ہوا یہ مرثیہ نہ صرف پُر درد اور پُر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں۔

عربی اور فارسی میں مرثیے کا آغاز شخصی مرثیے سے ہوا۔ازاں بعد شہادتِ عظمیٰ اس کا موضوع قرار پایا۔عربی اور فارسی کی مانند اردو میں بھی انفرادی اور شخصی مرثیے لکھے گئے۔اس ضمن میں میرزا اسداللہ خاں غالب کی وفات پر ان کے شاگرد مولانا الطاف حسین حالی کی غم آمیز نظم "مدوجزر اسلام"، سرسید احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد کی وفات پر علامہ شبلی نعمانی کی تاسف آمیز نظم، علامہ شبلی نعمانی کی رحلت پر سجاد انصاری کی بعض نظمیہ تخلیقات اور غالب وداغ دہلوی کی وفات پر علامہ اقبال کی لکھی ہوئی نظمیں بطور مثال ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔مولانا الطاف حسین حالی کی معروف نظم "مدوجزر اسلام" شخصی مرثیے سے زیادہ قومی مرثیے کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔(۲)

اردو مرثیے کا آغاز دکن سے ہوا۔پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "تاریخ مرثیہ گوئی" میں قلی قطب شاہ کو اردو کا قدیم ترین اور پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیا ہے۔(۳) اردو مرثیے نے تقریباً اڑھائی سو

سال کا ارتقائی سفر دکن ہی میں طے کیا۔ دکن کے معروف شاعر اور اردو شاعری کے باوا آدم ولی دکنی نے شروع شروع میں ایک طویل مثنوی لکھی اور امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کو اس مثنوی کا موضوع قرار دیا۔ یہ مثنوی ہیئت کے اعتبار سے تو مثنوی ہے مگر موضوع و مواد کے لحاظ سے اسے بلاشبہ مرثیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

دکنی دور میں مرثیے کے لیے کسی خاص ہیئت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ مربع، مخمس، مثلث اور مثنوی کی ہیئتیں سبھی مستعمل تھیں۔ میر اور سودا کے بعد مرثیہ نہ صرف باقاعدہ ایک صنف سخن کے طور پر مانا گیا بلکہ اس کی فنی و صنفی اہمیت و قیمت کا بھی تعین ہوگیا۔

بہمنی دور حکومت میں اشرف بیابانی نے اردو میں مرثیہ کو اپنی شعری صلاحیتوں سے تقویت بہم پہنچائی۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ اردو مرثیے کا آغاز قلی قطب شاہ کے زمانے میں ہوا۔ قلی قطب شاہ خود ایک صاحب دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، رباعی سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لہذا قلی قطب شاہ ہی اردو کے پہلے مرثیہ نگار قرار پاتے ہیں۔

قلی قطب شاہ کے بعد بیجاپور کے حاکم ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد عادل شاہ کے دور کے اردو شعرا نے اردو میں مرثیے لکھے یوں دکن میں اردو مرثیے کی ایک باقاعدہ روایت قائم ہوگئی۔ اسی روایت نے ارتقائی سفر جاری رکھا اور اردو مرثیہ ارتقا پذیر رہا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور میں اردو مرثیے کو نسبتا زیادہ قبول عام حاصل ہوا۔ اس کی دیگر کئی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ بیجاپور کے والی مذہباً اہل تشیع تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ بیجاپور میں مرثیہ کو عوام و خواص دونوں میں پذیرائی حاصل رہی۔

لکھنو میں اردو مرثیے کا ابتدائی دور میر ضاحک، میر حسن، میر فصیح، میرزا دلگیر، میر ضمیر اور میر خلیق کے دور کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ میر ضمیر کا نام اس ضمن میں خاص اہمیت کا حامل اس لیے بھی ہے کہ اس نے مرثیے کی تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ مرثیے کی ہیئت کا تعین کیا اور اس کے فنی اجزا معین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی اہمیت و حیثیت بھی اجاگر کی۔

مرزا فصیح، میر خلیق اور میر ضمیر نے مسدس کو مرثیے کی باقاعدہ ہیئت قرار دیتے ہوئے اسے عملا اپنایا۔ میر ضمیر کو باقی تمام مرثیہ گو شعرا پر اس اعتبار سے تقدم حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی بار باقاعدہ طور پر مرثیے کی ہیئت کے طور پر مسدس کو متعارف کرایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کا نقطہ نظر ذرا مختلف ہے۔ ان کے خیال میں مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت سب سے پہلے میر ضمیر کے بجائے میاں سکندر نے اختیار کی تھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ گمان غالب یہ ہے کہ مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت سب سے پہلے میاں سکندر نے ہی اختیار کی تھی۔ (۴)

ان سے قبل مرثیہ کے لیے کسی خاص ہیئت کی پابندی نہیں تھی۔ شعرا عموماً مذہبی اعتبار سے کار ثواب جان کر مرثیہ گوئی کرتے اور اپنی من پسند ہیئت میں شہادت عظمی بیان کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم الایام

میں مرثیے کی فنی ہیئت ولوازمات سے کہیں زیادہ توجہ شعرا اور سامعین دونوں کی اس بات پر ہوا کرتی تھی کہ مرثیہ زیادہ سے زیادہ دل سوز ہو، الفاظ اور تراکیب رقت آمیز ہوں، شہادت عظمیٰ کا بیان زیادہ سے زیادہ ہو اور ایک ہی مجلسی نشست میں ایک مرثیہ مکمل پورپر سنایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دور کے مرثیوں میں ۳۰ سے ۳۵ بند ہوا کرتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ میر ضمیر کے دور سے قبل مرثیہ دیگر اصناف سخن کے برخلاف اپنی ہیئت کے بجائے اپنے موضوع سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی لیے قدیم مرثیے ہیئت کے بجائے اس کے موضوع سے پہچانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک جگہ اسی حوالے سے لکھا ہے:

"ہمارے ہاں ہر صنف کا تعین عموماً اس کی ہیئت سے کیا جاتا ہے۔ لیکن مرثیے کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔ اس میں ہیئت کی کوئی شرط نہیں بلکہ اس کا نام اس کے موضوع کی نسبت سے مرثیہ ہے۔ چنانچہ اردو میں مرثیہ مختلف ہیئتوں میں ملتا ہے۔"(۵)

میر ضاحک کے بعد اردو مرثیے کو میر ببر علی انیس اور میرزا سلامت علی دبیر کی تخلیقی و فنی صلاحیتیں میسر آئیں اور ارتقا کی منازل کو بسرعت و کمال طے کیا۔ میر انیس اور میرزا دبیر کی لسانی مہارت، فنی گرفت اور لکھنوی مذہبی فضا کے سہارے اردو مرثیے کی صنفی ترقی و وسعت کے کم و بیش سبھی امکانات سے بہم پہنچے اور اردو مرثیہ کمال آشنا ہو گیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان دونوں باکمال مرثیہ گو شعرا کے مقام و مرتبے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے مرثیہ گو نہ ہوئے ہیں نہ آئندہ ہوں گے۔(۶)

میر انیس کا پورا نام ببر علی تھا اور انیس تخلص کرتے تھے۔ میر انیس کا حلیہ نیر مسعود نے یوں کھینچا ہے کہ قد میانہ مائل بہ درازی، ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس، اعضا مناسب و چست، چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوب صورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، گیہواں رنگ، مونچھیں ذرا بڑی، داڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دور سے دیکھنے پر منڈھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے کی رنگت میں رات بھر جاگنے کی وجہ سے زردی آ گئی تھی۔(۷) بالعموم گھٹنوں سے نیچا خوب گھیر دار کرتا پہنتے تھے۔ کرتے کی آستینیں باریک چنی جاتی تھیں جن کے لچھے بن کر خود بخود کہنیوں تک چڑھ جاتے تھے۔(۸)

ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔ والد گرامی سے قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی۔ گھر ہی میں خوش نویسی کی مشق بھی کرتے رہے۔ آغاز ہی سے طبیعت شعر کی طرف مائل تھی۔ انیس نے کم عمری ہی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ شاعری میں ان کے استاد میر خلیق تھے۔ ناسخ کو بھی انھوں نے اپنا کلام دکھایا تھا ادبی و مذہبی ماحول انھیں اپنے گھر پر ابتدائے عمر ہی سے میسر آیا۔ طبیعت میں شعری ذوق اور گھر میں شعری ماحول کے باعث انیس کی شعر گوئی کو فروغ پانے کے امکانات خوب میسر آئے۔

باقاعدہ مرثیہ نگاری سے قبل آغاز سخن سرائی غزل سے کیا لیکن طبیعت سے غزل کی موافقت نہ ہو پائی۔ غزل گوئی کے دور میں وہ "حزیں" تخلص کرتے تھے۔ والد گرامی میر حسن اور استاد شیخ امام بخش ناسخ کے مشورے پر غزل سے مرثیے کی طرف توجہ کی۔ ناسخ نے "انیس" تخلص کروایا۔

انیس کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ نگاری ورثے میں ملی۔اس صنف سے ان کی طبیعت موافق قرار پائی لہٰذا اسی صنف میں اپنے تخلیقی وفنی جوہر کے کمالات دکھائے۔میر انیس کے پڑ دادا میر ضاحک، دادا میر حسن، والد گرامی میر خلیق، تایا میر احسن، چچا میر احسان مخلوق سب کے سب شاعر تھے اور سب مرثیہ نگار تھے۔انیس کا یہ شعر اس ضمن میں معروف ہے:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

مرثیہ گوئی بھی انیس نے کم عمری ہی میں شروع کر دی تھی۔۱۹ سال کی عمر میں وہ فیض آباد کے رئیس مرزا محمد ابراہیم عرف مرزا سیدو کے یہاں دو سو روپے سالانہ پر مرثیہ خوانی کے لیے مقرر ہو گئے تھے۔(۹)

مرثیہ خوانی کو انیس نے باقاعدہ ایک فن بنا دیا تھا۔شروع شروع میں میر خلیق نے انھیں مرثیہ خوانی سکھائی تھی۔خلیق مرثیہ خوانی میں لب و لہجے کے تغیرات کے علاوہ صرف چشم و ابرو کے اشاروں سے کام لیتے تھے۔ان کے برخلاف میر ضمیر ہاتھوں سے بھی اشارے کرتے۔انیس نے کچھ انداز میر خلیق کا اپنایا اور کچھ میر ضمیر کا۔یوں میر خلیق اور میر ضمیر کے انداز کی آمیزش سے مرثیہ خوانی کا اپنا الگ طرز بنایا اور اسے بلندی تک پہنچا دیا۔(۱۰)

انیس ہرفن مولا تھے۔نیزہ بازی، شمشیر زنی، تیراندازی، شترسواری اور مصوری جیسے فنون سے بخوبی آگاہ تھے۔ان تمام فنون و امور میں سے شاعری نے ان کی طبیعت سے میل کھایا اور خود بھی خوب پھلی پھولی، انیس کا بھی نام رہتی دنیا تک امر کر دیا۔میر انیس فارسی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے۔انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی لیکن تخلیقی جوہر کا کمال اردو مرثیے میں کھلا۔

انیس اپنے والد گرامی میر خلیق کی مانند شعر اور مجلس دونوں پڑھتے تھے۔تحت اللفظ مرثیہ خوانی میں انیس کی مشق و مہارت اتنی تھی کہ عوام وخواص ان کے گرویدہ تھے۔انیس کی مرثیہ خوانی میں ان کا کلام، ان کا لب ولہجہ، آواز، چہرے کے تاثرات، اشارات، یہاں تک کہ منبر اور مکانِ مجلس بھی ان کی ظاہری ہیئت میں مل کر ایک ہو جاتے تھے۔جب تک وہ مرثیہ پڑھتے رہتے، سننے والے خود کو کسی دوسری دنیا میں پاتے اور انیس انھیں کوئی ورائے فطرت وجود یا کم از کم ایک عجوبہ معلوم ہوتے۔یہ انیس کی فنی شخصیت تھی جو قریب نصف صدی تک لوگوں کو منبر پر نظر آتی رہی۔(۱۱)

انیس کو لکھنو کے سامعین بے حد پسند تھے اور لکھنوی عوام کو انیس بھی اتنے ہی بھاتے تھے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھنو اجڑ گیا اور انیس لکھنو ترک کر کے حیدرآباد دکن ہجرت کر گئے۔حیدرآباد دکن میں انیس کو لکھنو جیسے سامعین میسر نہیں آئے۔اس بات کا انھیں شدید احساس بھی تھا چنانچہ بار بار کہا کرتے تھے "ہائے لکھنو تجھے کہاں سے لاؤں؟"(۱۲)

انیس کواپنے آبا و اجداد اوران کی رسم و ریت سے بڑا لگاؤ تھا۔اپنے خاندانی لباس کو بہت پسند کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ چو گوشہ ٹوپی تادم حیات سر پر رہی۔چند محفلوں میں محض اس لیے شرکت سے احتراز کیا کہ وہاں جانے کے لیے انھیں اپنے خاندانی لباس کے بجائے خاص لباس زیبِ تن کرنا پڑتا تھا۔

مراثیِ انیس کے خصائص

مرثیہ نگاری اپنے موضوع اور فنی ولسانی تقاضوں کے اعتبار سے دیگر تمام اصنافِ سخن سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں لسانی ولفظی نزاکتوں کا بھر پور ادراک رکھنا شاعر کے لیے از حد ضروری ہوتا ہے بصورت دیگر سامعین کی جانب سے شاعر پر توہینِ موضوع کا سنگین الزام بھی لگ سکتا ہے اور سماج میں مردود و مقہور بھی ٹھہر سکتا ہے۔انیس جس دور میں مرثیے کے میدان میں اپنے بھر پور تخلیقی وفنی کمالات کا مظاہرہ کر رہے تھے عین اسی زمانے میں میرزا سلامت علی دبیر بھی مرثیے کو اپنی شعری صلاحیتوں کے اظہار کی جولا نگاہ قرار دے کر خوب مرثیہ نگاری کر رہے تھے۔یہ دونوں باکمال شعرا ایک ہی زمانے میں ایک ہی علاقے میں ایک ہی موضوع پر ایک ہی مہینے [محرم الحرام] میں اپنے اپنے تخلیقی وفنی کمالات کے بیش بہا نمونے سامعین کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

میر ببر علی انیس کے مداحوں اور شاگردوں پر مشتمل ایک گروہ اپنے استاد کی تخلیقات کی داد دینے کے لیے ہر دم تازہ دم رہتا تھا جبکہ دوسری جانب یہی حال میرزا سلامت علی دبیر کے مداحوں اور شاگردوں کا بھی ہوا کرتا تھا۔دونوں گروہوں کی بھر پور کوشش ہوتی تھی کہ مقابل کے مراثی میں لسانی وفنی نقائص انتہائی باریک بینی سے تلاش کیے جائیں تا کہ اپنے مقابل کو زیر کیا جا سکے۔ان دونوں باکمال مرثیہ نگاروں کے مداحوں اور شاگردوں کی باہمی کشمکش اور اپنے اپنے استاد کی طرفدارانہ روش نے پورے لکھنو میں رثائی ادب کی تحسین وتنقید کی ایک فضا پیدا کر رکھی تھی۔اس صورت حال نے بلحاظ مجموعی اردو مرثیے کی فنی وفکری جہات میں وسعت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اردو مرثیے کے ارتقائی سفر کو مہمیز کیا۔انیس کے مرثیوں میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جو ان کے رثائی کلام کو دیگر مرثیہ گو شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔اس مقالے میں مراثیِ انیس کی انھی خوبیوں کو سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔

قواعد کی رعایت وترتیب

انیس زبان و بیان کے اصول وضوابط سے بخوبی آگاہی تو رکھتے ہی تھے ان کا بھر پور استعمال واہتمام ان کے مرثیوں کے ایک وصف کے طور پر بھی ابھر کر سامنے آیا ہے۔ان کے مرثیوں میں گرامر کے قواعد وضوابط کی ترتیب کا بھی حتی الامکان پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی معروف تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" میں انیس کے مرثیوں کی اسی خوبی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہاں تک انھیں معلوم ہے یہ صفت میر انیس سے زیادہ کسی اور کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔(۱۳)

ان کے رثائی کلام سے نمونہ ملاحظہ کیجیے:

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت
تب کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اٹھ کے ٹہلتی ہوں بھی ہوں حضرت
پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزا تلخ نہیں ہے

فصاحت و بلاغت

کلام خواہ حمدیہ ہو یا نعتیہ یا رثائی فصیح و بلیغ ہونا اس کی اہمیت وافادیت کا ضامن ہے۔حشو وزوائد پر مشتمل کلام نہ صرف تاثیر و تاثر کا حامل نہیں ہوتا بلکہ تضییعِ وقت کا بھی ایک بڑا سبب بنتا ہے۔انیس کے مرثیے اس خصوصیت کے حامل ہیں کہ یہاں فصیح و بلیغ الفاظ کا خوب استعمال نظر آ تا ہے۔انیس اپنے رثائی کلام کی فصاحت و بلاغت کا بھرپور احساس وادراک رکھتے تھے۔ایک جگہ اس امر کی جانب انھوں نے یوں توجہ دلائی ہے:

رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے حقیقت میری

صورت حال اور صورت واقع کے مطابق الفاظ کا استعمال انیس کے مرثیوں کی ایک خوبی ہے۔ جیسی بھی حالت وصورت بیان کرنی ہو انیس اس کے عین مناسبِ حال الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔کمال یہ ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے ہوئے یہ الفاظ نامانوس اور اجنبی نہیں ہوتے۔اس ضمن میں یہ بات درست ہے کہ انیس کے مرثیوں میں الفاظ کی بندش ایسی پرشکوہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر بار شگفتگی، روانی، سلاست شعر کی دلاویزی پیدا کرتی ہے۔ (۱۴)

تلوار کی تعریف درج ذیل بند میں ملاحظہ کیجیے جس میں بیک وقت منظر کشی، تشبیہات واستعارات، ذخیرہ الفاظ، بلاغت جیسے خصائص یکجا دکھائی دیتے ہیں:

زیور بہادروں کا، سپاہی کی ابرو
قتال خلق، تفرقہ انداز، جنگجو

سر تیز، جاں گداز، جگر سوز، شعلہ خُو
جھک کر گلے سے جس کے ملی پی گئی لہو

آفت تھی، صاعقہ تھی، قیامت تھی، قہر تھی
لشکر شکن تھی، برق تھی، آشوبِ دہر تھی
طوفاں تھی، آبشار تھی، قلزم تھی، لہر تھی
آتش تھی، شعلہ بار تھی، ناگن تھی، زہر تھی

مکالمہ نگاری

طویل نظمیہ شاعری میں مکالمے کا کردار بھی مسلمہ ہے۔ شاعر کرداروں کے مکالمات کا سہارا لے کر نہ صرف اپنے موضوع کے باطنی خیالات واحساسات کو تخلیق کا حصہ بناتا ہے بلکہ شعر کو حقیقت کے قریب تر ظاہر کر کے اس کی تاثیر کو دوچند کر دیتا ہے۔ مرثیہ اپنے موضوع اور خاص واقعے کے باعث مکالمے کا نہ صرف متحمل ہوتا ہے بلکہ مکالمے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ انیس میدانِ مرثیے کے نامی گرامی شاعر تو تھے ہی، صنف مرثیے کے مزاج دان بھی تھے۔ میرزا سلامت علی دبیر اپنی جگہ بڑے اور عظیم مرثیہ نگار سہی لیکن مرثیوں میں مکالماتی فضا پیدا کر کے مکالماتی انداز اپنانا انیس ہی کا کمال ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

بھاوج کے پاس آکے یہ بولے امام دیں
بس اب خدا کو یاد کر اے بے کس و حزیں

حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا
دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا

منظر نگاری

سامعین پر مرثیے کے اشعار اس وقت اثر کرتے ہیں جب شاعر واقعے کا منظر پرکشش الفاظ و انداز میں پیش کرے۔ میر انیس کے مرثیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے واقعات کی ایسی پرکشش منظر نگاری کی ہے کہ سامع کی نظروں کے سامنے گویا پورا واقعہ گھومنے لگتا ہے۔ ایم حبیب خان کے بقول "وہ کسی منظر کی اس طرح تصویر پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والا محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔"(۱۵)

انیس کے مرثیوں کا ایک ذیلی عنوان امام حسین کے سوتیلے بھائی حضرت عباس بھی ہیں۔ حضرت عباس اور ان کا گھوڑا جب نہر فرات پر پہنچے تو دونوں پر پیاس کا غلبہ تھا۔ اس صورت حال کی منظر کشی ملاحظہ کیجیے:

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

انیس نے باقاعدہ سپہ گری سیکھ رکھی تھی۔ وہ ایک شہسوار کی طرح جنگی گھوڑوں کی اقسام، عادات، نفسیات اوران سے متعلق اصطلاحوں سے بھی خوب واقف تھے جس کا اندازہ ان کے مرثیوں کے رزمیہ حصوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔(۱۶)

ابتذال سے اجتناب

انیس نے مجموعی طور پر واقعہ کربلا کوتمام جزئیات سمیت نظم کرنے کی سعی کی ہے۔اس نازک اور احتیاط طلب کام میں انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی اپنے کلام میں ابتذال ورکاکت کودر آنے نہیں دیا۔ایک قادرالکلام شاعر کی یہی بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ موضوع کواس کی تمام تر جزئیات سمیت بیان کرتے ہوئے کسی بھی جگہ لسانی رکاکت وابتذال کوقطعاراہ پانے کی اجازت نہیں دیتا۔امام حسین کی زبانی ان کے رفقا کی تعریف وتوصیف انیس نے یوں بیان کی ہے کہ کہیں بھی لسانی اعتبار سے کوئی غیر معیاری وغیر مہذب لفظ کلام کا حصہ نہیں بنا:

وہ گورے گورے جسم،قبائیں وہ تنگ تنگ
جن کی صفا کو دیکھ کر ہو آئینہ بھی دنگ

یہاں لفظ "صفا" کے استعمال نے پہلے مصرع میں موجود" گورے گورے جسم "اور" قبائیں تنگ تنگ" سے متوقع طور پر پیدا ہونے والے مبتذل تاثر کوختم کر کے ایک روحانی ومعنوی تاثر پیدا کر دیا ہے۔ابتذال کے امکان کومزید ختم کرنے کے لیے اگلے مصرعے میں کہا:

تھا جن کی چاہ میں دل یوسف بھی بےقرار

"دل یوسف" کی ترکیب نے معنوی صفا کے مفہوم کوواضح کردیا جس سے ابتذال رفع ہوگیا۔

سلاست وروانی

بالعموم اچھے شعر کی ایک فنی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ تعقید وثقالت سے مبرااور سلیس ورواں ہو۔بعض اوقات شاعر کوکسی گہرے،سنجیدہ اورو قیع خیال کونظم کرتے ہوئے لفظی تنگ دامنی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔الفاظ میں مطلوبہ خیال کی ترسیل وابلاغ کی وسعت کی کمی کا مسئلہ تب درپیش ہوتا ہے جب شاعر کاذخیرہ الفاظ محدود ہو۔

شہادت عظمیٰ کو سلاست و روانی سے نظم کرنا یقیناً انیس جیسے با کمال اور قادرالکلام شاعر ہی کا کام ہے۔انیس کے معاصر و مقابل عظیم مرثیہ گو شاعر میرزا سلامت علی دبیر کے مرثیوں کے مقابلے میں انیس کے مرثیوں میں روانی و سلاست کا وصف نمایاں طور پر برتری رکھتا ہے۔اس ضمن میں ایک مصرع بطور مثال ملاحظہ کیجیے:

کس نے یہ انگوٹھی دی رکوع و سجود میں [دبیر]
سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں [انیس]

سلاست و روانی کا وصف انیس کے تمام مرثیوں میں اول تا آخر نظر آتا ہے۔یہی وصف انیس کو اپنے عصر کے بعد بھی قبول عام بخشنے کا ایک سبب ہے۔

بمطابقِ محل و موقع جذبات نگاری

امام حسین کی شہادت کے المناک واقعے کے کئی مناظر ہیں۔غالباً انھی مختلف مناظر و مواقع کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرثیے کے اجزا کی ترتیب معین کی گئی ہے۔انیس نے اپنے مرثیوں میں اس حادثے کی مناسبت اور محل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے تمام جزوی واقعات، ممکنہ مکالمات اور جذبات و احساسات کو نظم کیا ہے۔بطور مثال اس موقعے اور اس سے متعلق احساسات کا بیان ملاحظہ کیجیے جب امام حسین کے بڑے فرزند جناب علی اکبر میدانِ جنگ کی طرف جا رہے تھے تو ان کی شریک حیات بی بی شہربانو کے دل میں جن احساسات و جذبات کا پیدا ہونا فطری امر ہے، ان کا بیان انیس نے کس فنکارانہ مہارت سے کیا ہے:

مومنو مرنے کو ہم شکل نبی جاتا ہے
دولت بانوئے بے کس کو زوال آتا ہے
ماں تڑپتی ہے، شہِ جن و بشر روتے ہیں
کس جوں بیٹے سے ماں باپ جدا ہوتے ہیں
علی اکبر ذرا تو میری محبت کی طرف دھیان کرو
اماں واری مری بستی کو نہ ویران کرو

امام حسین کے سوتیلے بھائی جناب عباس جب میدانِ جنگ کا رخ کرتے ہیں اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں تب امام حسین کے دلی جذبات کی جو کیفیت متوقع تھی اسے انیس نے اپنے ایک مرثیے میں یوں ضبطِ قلم کر دیا ہے:

بھائی کے آگے بھائی تڑپ کر جو مر گیا
صدمہ غضب کا سبطِ نبی پر گزر گیا
خنجر الم کا دل سے حلق تک اتر گیا
اکثر ہمیں بچاتے تھے لو میں ہَوا سے تم
ہم لٹ گئے ہیں گرد تو جھاڑو قبا سے تم

اخلاقی نکات ونصائح

شہادتِ عظمیٰ کا واقعہ اپنے اندر اخلاقی پند ونصائح کا ایک وسیع سلسلہ بھی رکھتا ہے۔مرثیہ نگار اپنے مرثیوں میں ان اخلاقی نکات کو بیان کر کے نہ صرف بیانِ شہادت کو ذریعہ وعظ ونصیحت بناتا ہے بلکہ معاشرے کی اصلاحِ احوال کی بھی سعی کرتا ہے۔مثلاً میدانِ جنگ میں اترنے کے بعد اپنا حسب نسب بیان کر کے مقابل پر اپنے خاندانی سلسلہ نسب کو واضح کر دینا تا کہ کوئی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو، جنگ میں پہل نہ کرنا، صبر وشکر کا مظاہرہ کرنا، دشمن کے اہل وعیال اور چھوٹے بچوں سے ہمدردی کا اظہار کرنا، گھٹیا پن سے احتراز کرنا اور اللہ تعالی کی ذات پر مکمل بھروسا کرنا وغیرہ۔انیس کے مرثیوں میں یہ وصف بھی جا بجا ملتا ہے۔ بطورِ مثال ایک بند کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

سب جانتے ہیں بیعت فاسق حرام ہے
اس کی طلب نہیں، یہ اجل کا پیام ہے
فرمایا سر کٹے تو کٹے کچھ الم نہیں
دانستہ دیویں ہاتھ سے عزت وہ ہم نہیں

الفاظ کی خوبصورت بندش

انیس کے مرثیے اردو الفاظ کے ایک بہت بڑے ذخیرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ ان لفظوں کو تہذیبی شائستگی اور لسانی نزاکت کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے جس طرح انیس استعمال کرتے ہیں وہ انھیں نہ صرف ممتاز مقام دلوانے کا سبب بنتا ہے بلکہ اردو شاعری کی تہذیبی وتمدنی لفظیات کے ذخیرے میں قابل قدر اضافے کا سبب بھی بن جاتا ہے۔اس بند کو ملاحظہ کیجیے:

خوشبو سے ان گلوں کی ہوا دشت باغ باغ
غنچے کھلے، ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہنچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ
دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ
خورشید بن گئے ،طبقے ارض پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذروں نے خاک کے

حاصل کلام

مختصر یہ کہ اردو میں مرثیہ نگاری کی روایت کا باقاعدہ آغاز ہندوستان ہی سے ہوا۔شمالی ہند اور دکن کے علاوہ لکھنو میں اس صنفِ سخن کو مرثیہ نگار شعرا نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنی اپنی استعداد وفہم کے مطابق فنی وتہذیبی معاونت فراہم کی۔اس کی ہیئت کے تعین کے لحاظ سے میر ضمیر اور مرزا رفیع سودا اس لیے اہم نام ہیں

کہ ان کے باعث مسدس کو مرثیے کی ہیئت کے طور پر قبول عام حاصل ہوا اور بعد کے مرثیہ نگاروں میں مرثیے کے لیے مسدس ہی کی ہیئت معین قرار پائی۔

انیس کا نام مرثیے کی تاریخ و روایت میں اس لیے انتہائی نمایاں نظر آتا ہے کہ انیس اپنی خاندانی روایات، طبعی میلانات اور لسانی گرفت کے باعث دیگر مرثیہ نگار شعرا کے مقابلے میں غالب رہے۔ تقریبا نصف صدی تک انیس اور ان کے مرثیوں کی گرفت لسانی، فنی، فکری اور مذہبی و ادبی لحاظ سے نہ صرف اہل لکھنو پر قائم رہی بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ انیس کے مرثیے ادبی و فنی بلندی، لسانی خصائص، تخیلاتی بلندی، جذبات نگاری اور لفظوں کے مہذبانہ استعمال کے اعتبار سے آج بھی اپنی ارفعیت کے حامل ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ میرزا سلامت علی دبیر بھی مرثیے کی تاریخ میں بلند مقام رکھتے ہیں مگر جو شہرت اور فنی و لسانی لیاقت و گرفت قدرت نے انیس کو عطا کی تھی وہ انیس ہی کا اختصاص ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سید قائم رضا نسیم، سید مرتضیٰ حسین فاضل [مرتبین]، جامع نسیم اللغات اردو، ناشرین: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۱۰۶۸

(۲) شبلی نعمانی، علامہ، اردو مرثیے کی سرگزشت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۴۳ء، ص ۱۱

(۳) حامد حسن قادری، پروفیسر، تاریخ مرثیہ گوئی، عشرت پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۱

(۴) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۱

(۵) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو مرثیہ نگاری کا ارتقاء، ایجوکشنل بکس پبلشرز، ۱۹۸۸ء، ص ۳۰۳

(۶) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۸ء، ص ۹۱

(۷) نیر مسعود، میر انیس، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۱ء، ص ۳۲

(۸) ایضا، ص ۳۵ (۹) ایضا، ص ۱۳

(۱۰)۔ ایضا، ص ۳۳ (۱۱) ایضاً، ص ۱۲

(۱۲) ایم حبیب خان، کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مقالات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۴

(۱۳) شبلی نعمانی، علامہ، موازنہ انیس و دبیر، عشرت پبلشنگ ہاوس، ص ۴

(۱۴) ایم حبیب خان، کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مقالات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ص ۴

(۱۵) ایم حبیب خان، کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مقالات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ص ۷

(۱۶) نیر مسعود، میر انیس، مقتدرہ قومی زبان اسلام اباد، طبع اول ۲۰۱۱ء، ص ۳۱